© rasailojaraid.com

انگریزی عہد میں اسلامی تہذیب

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

اٹھارہویں صدی عیسوی ہندوستان اور مسلمانوں کے لیے سیاسی بدنظمی، اقتصادی بحران کا عہد تھا، اس عہد میں اسلام مخالف طاقتیں خواہ اندرون ملک کی ہوں مثلاً سکھ اور مرہٹے یا بیرون ملک کی ہوں مثلاً پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز ملک پر قبضہ جمانے کے لیے شورشوں اور سازشوں کا جال پھیلائے ہوئے تھیں۔ حکمراں مغلیہ خاندان اپنی نااہلی اور کمزوری کے باعث ان سب کا مقابلہ کرنے سے قاصر اور ان کے آگے بے بس تھا۔ ان طاقتوں میں انگریز زیادہ چالاک، عیار اور صاحب ثروت تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی بینر کے نیچے برطانوی اقتدار کے قیام کی راہ ہموار کر رہے تھے اور حکومت تک پہونچنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں اسلامی تہذیب ہندوستان میں شکست و ریخت کے کٹھن مراحل سے گذری، مسلمان سیاسی طور پر مغلوب اور محکوم ہوئے، اقتصادی طور پر تباہ و برباد کیے گئے ان کی ضعیف الاعتقادی اور اخلاقی کمزوری بھی زیادہ ابھر کر سامنے آئی اور ان کی عزت اور وجاہت سب کچھ جاتی رہی۔ انگریزوں نے اسلامی تہذیب کے آثار مٹانے اور انگریزی تہذیب کے نقش جمانے کے لیے طاقت، حیلہ اور مکر و فریب سے کام لینا شروع کیا، ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک سیاسی اور اقتصادی طور پر انگریز پیش قدمی کرتے رہے اور اپنے تعلیمی و ثقافتی مراکز قائم کرتے رہے جبکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء تک وہ اس ملک کے حکمراں رہے اور سیاست، معیشت، تعلیم، ثقافت سب کچھ انہی کے کنٹرول میں تھا وہی سیاہ سفید کے مالک تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۷۵۷ء کی پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے مسلمانوں کو شکست دے کر ہندوستان میں اپنا اثر قائم کرنے کا حوصلہ پایا۔ یہ گویا انگریزوں کے سیاسی اثر و رسوخ کی پہلی منزل تھی۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں مسلمانوں کی شکست نے بہار و بنگال میں انگریزی حکومت کا راستہ صاف کر دیا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو شہید ہوئے اور میسور کی ریاست مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی، مگر صحیح معنوں میں انگریزوں کے اقتدار کی شروعات ۱۷۷۳ء سے ہوتی ہے جبکہ ریگولیٹنگ ایکٹ منظور ہوا اور ۱۷۷۴ء میں نافذ ہوا، اس ایکٹ کی رُو سے ہندوستان کے عمّال حکومت پارلیامنٹ اور وزارت انگلستان کے سامنے جوابدہ قرار دیے گئے اور انگریزی طاقت کو متحد کرنے کے لیے صوبہ بمبئی اور مدراس کو بنگال کے ماتحت کر دیا گیا۔[1]

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کر کے بادشاہ شاہ عالم کو گرفتار کیا اور اس کو ایک ایسا معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا جس کے ذریعہ بادشاہ کی حکومت شہر، قلعہ، دہلی تا قطب محدود کر کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت جیسے فارسی زبان اور قاضیوں کا تقرر وغیرہ اپنے ذمہ لے لیا۔[2] اور عوامی طور پر یہ مشہور ہو گیا "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم"۔ ۱۸۲۷ء میں لارڈ امہرسٹ نے اعلان کر دیا کہ ہماری گورنمنٹ اب تیموریہ خاندان کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے۔[3]

شاہ عبدالعزیز (م ۱۸۲۴ء) نے جو فقہاء کے سرخیل تھے انگریزوں کے خلاف اپنے مشہور فتویٰ میں اس کی صراحت کی ہے کہ:۔

"اس شہر دہلی میں اسلامی قانون بالکل عمل میں نہیں آیا اور عیسائی حکمرانوں کا قانون بغیر کسی رکاوٹ کے رائج ہے جیسا کہ انتظامی اور دیوانی معاملات میں ہے، یا سزاؤں کے سلسلے میں غیر مسلموں کا تسلط قطعی ہے۔ البتہ وہ مسلمانوں کے رسوم یعنی نماز عید اور جمعہ میں دخل انداز

---

[1] عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ صفحہ ۳۸، کراچی ۱۹۶۷ء
[2] فضل حق خیرآبادی، الثورۃ الہندیۃ اردو ترجمہ، صفحہ ۱۹۰، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء
[3] سر سید احمد خاں، اسباب بغاوت ہند صفحہ ۱۰، لاہور ۱۹۵۷ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہوتے ۔ یا اذان اور قربانی کے سلسلہ میں اعتراض نہیں کرتے، لیکن
ان کا بڑا اصول یہ ہے کہ اپنی مطلق حکمرانی سے نفع حاصل کریں اس
شہر سے کلکتہ تک انگریزوں کا راج مکمل ہے"۔ [۱]

۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان فوجیوں نے مل کر بغاوت کی عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا مگر یہ بغاوت ناکام ہوگئی۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر کے رنگون جلا وطن کیا گیا، شاہزادوں، باغیوں اور علماء کی بڑی تعداد پھانسی پر لٹکائی گئی، رسمی طور پر بھی مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ملک پوری طرح انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء تا ۱۹۴۷ء تک کا ڈیڑھ سو سالہ عہد ہندوستانیوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص غلامی کا عہد ہے، کیونکہ یہ صرف اقتدار کی منتقلی اور حکومت کرنے والے افراد کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ نظریہ سیاست، معیشت، تہذیب تعلیم ادب اور سماج سب کچھ کی تبدیلی کا اعلان تھا اور اس تبدیلی کے آثار زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھے۔ اس کے اثرات سے آج تک ہندوستانی عوام اپنے کو آزاد نہ کر سکے۔ اگرچہ ملکی آزادی کو پچاس سال کا عرصہ گزر گیا۔ انگریزی حکومت کے دور رس اور ہمہ جہت اثرات کے تفصیلی جائزے کی گنجائش نہیں البتہ بعض اہم اثرات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

معاشی اور اقتصادی اثرات

انگریزی اقتدار کا بُرا اثر مسلمانوں کی معیشت اور اقتصادی حالت پر پڑا، جو لوگ حکمراں، امراء اور اصحابِ ثروت تھے ان کی جائداد ضبط کی جا چکی تھی، ان کے کاروبار ختم ہو چکے تھے اور ان کی صنعت تباہ ہو چکی تھی، کپڑا بننے کی صنعت جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اس کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور صنعت کار، مزدور سبھی اپنی محنت کے صلہ اور جائز منافع سے محروم کر دیے گئے تھے۔ جوارِ دہلی میں نیل کی کاشت بھاری ٹیکس کی نذر ہو چکی تھی۔

---

[۱] شاہ عبدالعزیز دہلوی، فتاویٰ عزیزیہ ص ۱۷، ۱۶ کانپور ۱۹۰۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنگال جو سلطنتِ مغلیہ کا سب سے زرخیز اور خوش حال صوبہ تھا اور جسے سلطنت ہند کی پیداوار کا ذخیرہ کہا جاتا تھا اس کا حال یہ ہوگیا کہ چند ہی دنوں میں غیر آباد ہو کر رہ گیا، کاشتکار زمین چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے [۱] گورنمنٹ کی طرف سے بھاری ٹیکس اور اس کی وصولیابی میں بے رحمی اور کوڑوں کی سزاؤں نے معیشت کو تباہ کر دیا، دوسری طرف مسلمان جاگیرداروں اور زمین داروں کی تمام املاک جو وسعت میں تمام بنگال کی ایک چوتھائی تھی، گورنمنٹ نے ضبط کر لی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے سیکڑوں شریف اور خوش حال خاندان نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے اور ہزاروں افراد بے کسی اور مفلسی کے عالم میں دربدر پھرنے لگے [۲]

اڑلیسہ کے مسلمانوں نے ملکۂ برطانیہ کو اپنی معاشی بدحالی کی طرف توجہ دلانے کے لیے درخواست بھیجی جس میں وضاحت تھی کہ اڑلیسہ کے مسلمان اس قدر تباہ کر دیے گئے ہیں کہ اب ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی..... ہماری حالت ان مچھلیوں کی طرح ہے جو پانی سے نکال کر باہر پھینک دی گئی ہوں۔ سرکاری ملازمتوں سے خارج ہونے کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجہ کو پہونچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپے ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے زیادہ دور دراز مقامات تک جانے، ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبیریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بخوشی تیار ہیں۔" [۳]

مسلمانوں کی معیشت کا بڑا انحصار سرکاری ملازمت پر تھا مگر انگریزی حکومت میں یہ دروازہ ان کے لیے بند ہو گیا، درجۂ اول کی ملازمت انگریزوں اور درجہ دوم کی ملازمت ہندوؤں کے لیے تھیں۔ ہنٹر نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمۂ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں گو اس میں شک نہیں کہ اس طرزِ عمل سے

---

[۱] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص۶

[۲] سردار عبدالرحیم، خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ علی گڑھ ۱۹۲۵ء

[۳] ڈبلو، ڈبلو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، اردو ترجمہ صادق حسین ص۲۵۶، اقبال اکیڈمی، لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنگال کے گھرانے بالکل تباہ و برباد ہوگئے۔[1] ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ "مسلمان یہاں تک اب قعرِ مذلت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی ان کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے ان کی قابلِ رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔"[2]

انگریزوں نے فارسی زبان ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان بنایا اور سرکاری دفاتر میں کام کاج کے لیے انگریزی کا جاننا لازم ہوگیا چنانچہ ملازمتیں ان لوگوں کو دی جانے لگیں جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ گورنمنٹ نے اشتہار جاری کیا کہ جو شخص سرکاری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور انگریزی زبان میں سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکٹ پر جن کو سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے، منحصر ہوگئیں[3] مسلمان انگریزی تعلیم سے دور اس لیے رہے کہ اس کے ساتھ مسیحی مذہب کی اشاعت جوڑ دی گئی تھی۔ مجموعی طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان معاشی طور پر پریشان اور تباہ حال ہوگئے، یہاں تک کہ بنگال کے قحط کے ایام میں بعض نادار افراد نے اپنے بچوں کو بیچ ڈالا۔

انگریزوں کی معاشی پالیسی کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے اسی عہد کے آخر میں لکھا تھا:

> "گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی اب وہ روٹیوں کو محتاج ہو چکی ہے، اس کو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے اور اب اس کی ۹۰ فی صد آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے، ساہوکار سے برطانوی سامراج کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام عدالت اس کے لیے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سود خوار پٹھان کے لیے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔"[4]

---

[1] ایضاً ص ۲۴۲ — [2] ایضاً ص ۲۵۵ — [3] اسباب بغاوتِ ہند ص ۱۲۸

[4] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان ۱/ ۲۶۔۲۴، لاہور ۱۹۸۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی اثرات

انگریزوں کے قدم جمانے کے ساتھ ہی ہندوستان میں مسیحی مبلغین کی جماعتیں تبلیغ میں سرگرم عمل ہوئیں، ان میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں جماعتیں شامل تھیں۔ عیسائیت کا پہلا مبلغ سینٹ ٹامس تھا اس کے بعد دوسرا ٹامس فرانسوازیوتری نے تبلیغ کی کوشش کی[1] ۱۸۱۳ء تک یہ جماعتیں اپنے طور پر مسیحیت کا پرچار کرتی رہیں مگر ان کے کچھ زیادہ اثرات اہلِ ہند پر نہ پڑے۔ اگر پڑے بھی تو ساحلی علاقوں تک محدود رہے۔ ۱۸۱۳ء کے بعد ان کو سرکاری حمایت اور سرپرستی حاصل ہوگئی، اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی تجدید ہوئی تو برطانوی پارلیامنٹ نے اصرار کیا کہ اس میں ایک دفعہ یہ شامل کی جائے جس میں یورپ کے مسیحی مبلغین کو ہندوستان میں تبلیغ کرنے اور آباد ہونے کی اجازت دی جائے[2]

اس کے بعد مسیحی پادریوں اور مبلغوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ ۱۸۶۵ء میں ان کی کارکردگی کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے مستشرق گارساں دتاسی نے فرانس میں کہا تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ۵۱۵ مبلغین مسیحیت کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں انگلیکن اور دوسرے غیر کیتھولک شامل ہیں ہمارے خیال میں کیتھولک مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں کم و بیش دس لاکھ کیتھولک موجود ہیں[3]

عیسائی مبلغین کو نہ صرف حکومت کی سرپرستی حاصل تھی بلکہ انگریز افسران اور ملازمین ان کی مالی امداد کرتے اور ان کی مشکلات کو دور کرتے اور ہر طریقہ سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے بقول سرسید احمد خاں "اکثر حکام اور فوج کے افسران نے اپنے ماتحتوں سے مذہبی گفتگو شروع کر دی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے

---

[1] موسیو گارساں دتاسی، خطبات ص ۸۵، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

[2] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۸۸

[3] خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا[۱]
۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں یتیم بچوں کو سرکاری سرپرستی میں عیسائی بنایا گیا جو بقول سرسید احمد خاں تمام اضلاع مغربی وشمالی میں گورنمنٹ کے ارادہ کا نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح مفلس اور محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے[۲] نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس خطوط بھیجے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہو گئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی، مذہب بھی ایک ہونا چاہیے اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ ایک مذہب عیسائی ہو جاؤ[۳]
مسیحی مبلغوں نے سرکاری مراکز، افسران کی کوٹھیوں اور گرجا گھروں سے زیادہ کاروباری مراکز، بازاروں، میلوں اور اجتماع گاہوں کا رخ کیا جہاں ہندوستانی عوام کی بڑی تعداد جمع ہوتی۔ بقول گارساں دتاسی "مسیحی مبلغین اپنا مذہبی جوش میلوں کے موقع پر ظاہر کرتے ہیں، ہندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگا لیتے ہیں۔ تقریریں اور وعظ کہتے ہیں۔ رسالے تقسیم کرتے ہیں[۴]"
یہ مبلغین صرف عیسائیت کے پرچار اور انجیل کی تعلیم پر اکتفا نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقامات کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہونچتی تھی[۵]
اعتراف کرنا چاہیے کہ عیسائی مبلغین جو کام اپنی انتھک محنت کے باوجود مسلمانوں میں نہ کر سکے وہ مغربی علوم اور انگریزی تہذیب نے درس گاہوں کے ذریعہ کر کے دکھا دیا۔ ملحدانہ خیالات اور باطل افکار و نظریات بھی مسلم معاشرہ میں داخل ہونا شروع ہو گئے، اور اس کا نشانہ وہ نوجوان بنے جو سرکاری درس گاہوں میں

---

[۱] اسباب بغاوتِ ہند ص ۱۲۲ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۱۲۹

[۴] خطبات گارساں دتاسی ص ۵۰۲

[۵] اسباب بغاوت ہند ص ۱۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم حاصل کر رہے تھے، چنانچہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائڈ کی جنسی تعلیم، ہیگل اور مارکس کے اشتراکی نظریات انہی راستوں سے درآئے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شدید طور پر متاثر کیا۔ آزاد خیالی، آوارہ مزاجی، مذہبی تشکیک، ملحدانہ خیالات، مذہب بے زاری ان کی پہچان بننے لگی، یہاں تک کہ ان نوجوانوں کا ایک طبقہ اس حد تک بڑھا کہ مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی اشخاص کا مذاق اڑانے لگا۔ اس کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی انگریز مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہوئے تو ان کو خالص مسلمان بھی رہنے نہیں دیا۔ انگریزوں کو بعض ایسے مسلمان بھی میسّر آگئے جنھوں نے اسلامی عقائد اور تعلیمات کی ایسی تعبیریں اور توجیہیں کیں جن کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں راسخ العقیدگی کی جگہ مذہبی تشکیک پیدا ہونے لگی۔

تعلیمی اثرات

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم جو صدیوں سے ان کی ذہنی وفکری اور علمی تعمیر کر رہا تھا اور جو ان کی تہذیب، مذہب، تاریخ اور عقائد و احکام پر مشتمل تھا انگریزوں کے آنے کے بعد بری طرح متاثر ہوا، انگریز اپنے ساتھ جو نظامِ تعلیم لائے تھے اس کا نفاذ اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ختم ہو جائے۔

چنانچہ وہ مدارس جن سے علماء، فقہاء، قاضی، صدر الصدور، مفتی اور محدث پیدا ہوتے تھے یا تو سرپرستی سے محروم ہوئے، یا سکون و اطمینان سے محروم ہوئے یا بغاوت کے بعد منہدم کر دیئے گئے اور جو بچے وہ کس مپرسی کا شکار ہوئے۔ ممتاز دانش ور عبد اللہ یوسف علی نے ان درس گاہوں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "ان انقلابات کی وجہ سے جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی مطلع کو تاریک کر دیا تھا ہندو اور مسلمانوں کی درس گاہوں کو سخت نقصان پہونچا، اس نقصان کی دو صورتیں تھیں۔ بہت سی صورتوں میں یہ درس گاہیں پبلک عطیات سے محروم ہو گئیں لیکن عطیوں کے نقصان سے زیادہ اس امن و اطمینان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا فقدان تھا جو شاگرد اور استاذ دونوں کے دماغی مشاغل کے لیے ضروری ہے.... اسلامی مکتبوں اور درس گاہوں کو اور بھی نقصان پہونچا، کیونکہ ان کا براہِ راست ان حکومتوں سے تعلق تھا جن کے اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا" [۱]

انگریزوں نے اسلامی مدارس اور تعلیم کی ہر ممکن حوصلہ شکنی کی، اس کے پیچھے یہ ذہن بھی کارفرما تھا کہ اگر یہ سوتے خشک ہو جائیں تو اسلامی تہذیب خود بخود کمزور ہو جائے گی اور انگریزی اقتدار، تہذیب اور مذہب آسانی سے پھیل سکے گا۔ انگریز جس نظام تعلیم کو رائج کر رہے تھے گو کہ وہ، طبیعیات، جغرافیہ، سماج، تاریخ اور ریاضی جیسے مضامین پر مشتمل تھا مگر اس کی اساس اور ماحول مسیحی مذہب تھا اس لیے مسلمان اس نظامِ تعلیم سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ گارساں دتاسی نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔

"اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں۔ مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں اس لیے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہبِ اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں"۔ [۲]

ایک دوسرے موقع پر مستشرق دتاسی نے خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ "حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کے لیے جو مغربی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اس کا اثر بھی مذہب کے نشر و اشاعت میں بہت مدد دے رہا ہے۔" [۳]

علامہ فضل حق خیر آبادی نے لکھا ہے کہ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے ملک کے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں

---

[۱] انگریزی عہد میں مسلمانوں کے تمدن کی تاریخ ص ۹

[۲] خطباتِ گارساں دتاسی، ص ۳۰۲ [۳] ایضاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب برپا کرے گا۔ اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے ہر طرح کے مکر و فریب سے کام لینا شروع کیا، انھوں نے بچوں اور نا فہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس کو مٹانے کی پوری کوشش کی[1]۔

سرکاری مدارس کے سلسلہ میں مسلمانوں کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ مدارس و مکاتب صرف عیسائی بنانے کے لیے کھولے گئے ہیں وہ گورنمنٹ کے ارادہ کو سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو ختم کر دے تاکہ آئندہ عیسائی مذہب پھیل جائے[2]۔

۱۸۰۰ء میں سر چارلس ووڈ نے ہندوستان میں انگریزوں کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں ایک مراسلہ لکھا جو آگے چل کر انگریزی تعلیم کا منشور اعظم بن گیا۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر تعلیمی کمیشن قائم ہوا جس نے انگریزی نظام تعلیم کی افادیت کا جائزہ لیا اور ووڈ کے نقطۂ نظر کو مؤثر طور پر نافذ کرنے کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ ووڈ نے اپنے مراسلہ میں مغربی طرز کی تعلیمی پالیسی نافذ کرنے اور صرف انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا[3]۔

۱۸۳۵ء میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ جس قدر رقوم مقاصد تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیے[4] اس نے مشرقی زبان اور علوم کی تعلیم کو مجروح اور متاثر کیا۔ ۱۸۵۴ء میں سارے ہندوستانیوں کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک عام نصاب تعلیم بنایا جائے جس کے ذریعہ مغربی علوم کو رائج کیا جائے اور ہر صوبہ میں لفٹننٹ گورنر کے ماتحت ایک محکمۂ تعلیم قائم کیا گیا[5]۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص۱۴

[2] اسباب بغاوت ہند ص۱۲۵

[3] Modern Indian History p.276 New Delhi, 1963.

[4] عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص۲۵

[5] خطبات گارساں دتاسی ص۵۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ فی نفسہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مسلمان مخالف نہ تھے کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فتویٰ دے چکے تھے کہ انگریزی کالج میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب سب درست ہے [۱] مگر حکومت کی تعلیمی پالیسی بالخصوص عیسائیت کی ترویج کے پیش نظر مسلمان کنارہ کش اور محتاط تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں بنگال میں یونیورسٹی کی ڈگری کے لیے پندرہ سو ہندوستانی طلبہ اور چار سو سینتالیس (۴۴۷) دوسرے طلبہ امتحان دینے گئے وہ سب ہندو تھے ان میں مسلمان نام کو نہ تھا [۲] مگر معاشی مجبوریوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کو سرکاری مدارس میں جانے پر آمادہ کر دیا اور ۱۸۶۹ء میں سرکاری مدارس میں تعلیم پانے والے مسلمان طلبار کی تعداد ۹۰ ہزار تھی جبکہ ہندوؤں کی تعداد ۳۰ لاکھ تھی [۳]

اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزوں نے جو تین یونیورسٹیاں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں قائم کیں ان میں مشرقی علوم کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں صوبۂ شمال مغربی کے باشندوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے نام ایک درخواست بھیجی کہ جس طرح یونیورسٹی مغربی علوم کی سند دیتی ہے اسی طرح مشرقی علوم کی بھی سند دے، مگر اس درخواست کو یونیورسٹی نے نامنظور کر دیا۔ چنانچہ اپیل کنندگان نے فیصلہ کیا کہ مشرقی علوم کی تدریس کے لیے وہ الگ سے یونیورسٹی قائم کریں گے [۴]

جو مسلمان انگریزی درسگاہوں میں گئے وہ مغربی علوم سے بہرہ ور ہو کر سرکاری ملازمتوں کے اہل ضرور ہوئے اور ان کو معاشی آسودگی بھی ملی مگر اسلامی تہذیب و ثقافت سے ان کا رشتہ کمزور پڑ گیا جو قوم اپنے مذہب اور تہذیب سے ناواقف ہو جائے وہ اس کی حفاظت اور اشاعت بھی نہیں کر سکتی چنانچہ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ مولانا مودودی ان حضرات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[۱] اسباب بغاوت ہند ص ۱۲۷

[۲] خطبات گارساں دتاسی ص ۵۵۲

[۳] ایضاً ص ۸۰۳

[۴] ایضاً ص ۶۷۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"کم و بیش ۹۰ فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اسلامی تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے، اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گذری...... وہ مسلمان ہونے پر نہیں ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہلِ فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں۔ حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں"۔ [1]

سرکاری درس گاہوں کے علاوہ خود مسلمانوں کے زیرِ انتظام بھی انگریزی تعلیم کی متعدد درس گاہیں قائم ہوئیں جہاں مغربی علوم کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی کسی قدر لحاظ رکھا گیا اور بلا شبہ ان درس گاہوں نے مسلمانوں کی جدید تعلیم اور ذہنی تعمیر کا بڑا کام کیا، معاشی کفالت میں بڑی مدد دی، سماجی زندگی کی تشکیل میں نیا مواد فراہم کیا مگر چونکہ نظام تعلیم، غالب مضامین، درس گاہوں کا ماحول، مزاج اور اندازِ تدریس سب کچھ انگریزی درس گاہوں پر منحصر تھا اس لیے ان میں بھی وہ اثرات پیدا ہوئے جو اسلامی تہذیب کے لیے منفی حیثیت رکھتے تھے۔ ممتاز ماہر تعلیم سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مسلمانوں کی مغربی تعلیم کے نصب العین، نظام اور اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

" اس نظامِ تعلیم کے پیش نظر ظاہر ہے یہی ہو سکتا تھا کہ نوجوان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں، سرکاری ملازمت حاصل کریں۔ اپنا پیٹ پالیں، معاشرت میں مغربی نمونوں کی بھلی بری نقل اتار سکیں۔ مذہب کے سرے سے منکر تو نہ ہوں مگر اس کی حیات بخش اور زندگی پرور قوت سے محروم رہیں تو حرج نہیں، سیاست کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہیں۔ شخصی مفاد کی خاطر قوم کا نام لینے کی ضرورت پڑی تو

---

[1] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہنر زمانہ خود سکھا دے گا.....

ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے اور ان میں اپنی قوت اور وقت اور وسائل کا جو صرف کثیر نصف صدی سے زیادہ سے کیا ان کو دیکھیے۔ کیا انھوں نے بھی اسی نصب العین کی خدمت انجام نہیں دی؟ اکبر مرحوم نے تعلیم یافتہ آدمی کی زندگی کا جو خاکہ کیا ہے کہ بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے۔ کیا وہ ہمارے ان ملّی اداروں کے تعلیم یافتوں پر بھی صادق نہیں آتا، ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں" [1]

بایں ہمہ یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ جدید تعلیم نے مسلم ثقافت پر مثبت اثرات بھی مرتب کیے جن میں تحقیق و تنقید کے جدید مناہج، سوچ اور فکر کے سائنٹفک اسلوب، علوم میں مہارت کی نئی تکنیک اور جمہوری طرز انتظام کے ساتھ مشرقی علوم کی کتابوں اور نوادرات کی کھوج اور تلاش، ان کا جمع کرنا ان سے استفادہ کو سہل تر بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ مسلم ثقافت میں علمی جمود کو توڑنے اور ان میں حرکت و جوش پیدا کرنے میں ان عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

لسانی اور ادبی اثرات

مسلمانوں کی سرکاری اور ادبی زبان فارسی تھی، انگریزوں نے اس کو ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان بنایا۔ فارسی زبان کی حیثیت کم ہوتے سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر جو اثر پڑا اس سے زیادہ علمی اور ثقافتی تدریس اور تحریک پر برا اثر پڑا، جب کسی قوم کی زبان کاٹ دی جائے تو اس کی تہذیبی سرگرمیاں محدود و متاثر اور پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ صدیوں کا علمی اور تہذیبی سرمایہ جو اس زبان سے متعلق تھا۔ سرپرستوں، محافظوں اور قدردانوں کی کمی کے باعث قصۂ پارینہ ہو کر رہ گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فارسی کی جگہ اردو زبان نے لی اور بعض انگریز افسران

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین، تعلیمی خطبات ص۲۳۴ نئی دہلی ۱۹۷۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دانشوروں نے اس کی ترویج و ترقی میں دلچسپی لی جن میں جان گلکرسٹ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ مگر اول تو یہ سرکاری زبان نہ تھی۔ دوم یہ کہ اردو میں علمی اور تہذیبی سرمایہ کا ذخیرہ نہ تھا اس لیے وہ فارسی کی جگہ نہ لے سکی۔ بعد میں اردو مصنفین علماء اور اسکالرس نے ضرور اس کو علمی زبان بنانے میں بڑی کوشش کی، لیکن اس زبان میں عربی و فارسی کے جو الفاظ تھے اور جن کی بنا پر اردو علمی اور تہذیبی زبان بنی انگریز یہ کوشش کرتے رہے کہ ان الفاظ اور اصطلاحوں کو نکال دیا جائے اور ان کی جگہ انگریزی اور ہندی کے الفاظ استعمال کیے جائیں تاکہ مسلمانوں کی حکومت اور ثقافت کے اثرات ختم ہو جائیں۔ گارساں دتاسی نے سر چارلس ٹریولین کے متعلق لکھا ہے۔

"وہ چاہتے ہیں کہ عربی و فارسی کے متعلق الفاظ جو مسلمان فاتحین کے اثر سے ہندوستانی زبان میں داخل ہو گئے ہیں، اس زبان سے خارج کر دیے جائیں اس لیے کہ ہندی کے ایسے الفاظ کثرت سے موجود ہیں جو بآسانی ان عربی و فارسی لفظوں کی جگہ لے سکتے ہیں۔ سر چارلس ٹریولین نے مجھے لکھا ہے کہ ہندوستانی زبان میں آج کل یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ انگریزی کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا جائے۔ اس رجحان سے ہندوستانیوں اور انگریزی قوم کے موجودہ تعلق کا پتہ چلتا ہے"[1]

عربی و فارسی الفاظ کی مخالفت انگریزوں کے ساتھ ہندو بھی کر رہے تھے، بلکہ ان کی تحریک زیادہ تعصب اور عناد پر مبنی تھی۔ بقول دتاسی ہندوؤں کی عام طور پر یہ خواہش ہے کہ عربی و فارسی کے عنصر سے قطعی احتراز کیا جائے، بلکہ بعض ہندو ایسے بھی ہیں جو لاطینی رسم خط کو اردو رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے دلوں میں اسلامی حکومت کی مخالفت کے باعث پیدا ہوئی ہے۔[2] انگریزی حکومت ہندوؤں کے ساتھ تھی اور اسلامی تہذیب کے آثار مٹانے کے لیے وہ بھی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ مستشرق دتاسی کے بقول "برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ص۱ [2] ایضاً ص۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگ خوش ہو جائیں گے اور چونکہ ہندوستان کی آبادی کی کثرت انہی پر مشتمل ہے اس لیے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے [۱]

اخلاقی اور تہذیبی اثرات

جس طرح انسان کے قویٰ اور اعضاء کمزور پڑتے ہیں تو مختلف قسم کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں، اسی طرح جس قوم کی معاشی حالت کمزور ہوتی ہے اور تعلیم کا نظام بگڑ جاتا ہے تو اس کا اثر اس کی اخلاقیات پر بھی پڑتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "غریبی کفر کے قریب ہے" تو اس میں بڑی سماجی بصیرت اور دانائی چھپی ہوئی ہے، ہندوستان میں بھی اقتصادی بحران اور متوازن تعلیمی نظام کے فقدان کا اثر مسلمانوں کی اخلاقی اور تہذیبی زندگی پر پڑا اور ان میں مختلف قسم کے اخلاقی اور سماجی عیوب ظاہر ہوتے لگے۔

عوام میں اخلاقی خرابیاں جڑ پکڑتی ہیں تو ان کا ازالہ دو طریقوں سے ہوتا ہے: ایک مذہب دوسرا قانون۔ مذہب دعوت و تبلیغ، وعظ و تلقین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ایک عام اخلاقی ماحول پیدا کرتا ہے۔ برائیوں کی طرف مائل ہونے والے خود کو معاشرہ میں اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس سے برائیاں کمزور پڑتی ہیں، ان کی عام اشاعت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف نظامِ قانون تعزیرات اور سزاؤں کے ذریعہ ان خرابیوں پر روک لگاتا ہے، جس سے نہ صرف مجرموں کے حوصلے پست ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہوتی ہے۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے وقت یہ دونوں عوامل کمزور پڑ گئے تھے، اور انگریزی عہد میں صورتِ حال اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ سرہنری اسٹریچی کو کہنا پڑا:

"لوگ پہلے کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ شہوت پرست ہو گئے ہیں، عیاری، دروغ حلفی، دھوکا اور جھوٹ کے خصائل رذیلہ یقیناً زیادہ عام ہو گئے ہیں بزرخیری بد چلنی، بداخلاقی، شہد این کے اخلاقی عیوب ایسے نظامِ حکومت میں لازمی طور پر

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑھ گئے جو اگرچہ اسلامی قانون کو کام میں لانے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن ان بد اخلاقیوں کی پاداش میں ملزم کو سزا نہیں دیتا.... میرے پاس اس امر کو باور کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ کلکتہ میں قانون کا نظام جو ہم نے قائم کیا ہے اس سے لوگوں کے اخلاق زیادہ خراب ہو گئے ہیں"۔ [۱]

دوسری طرف جو لوگ معاشی خوش حالی کی تلاش میں انگریزی اور سرکاری تعلیم گاہوں کی طرف گئے تھے ان سے ان کو تعلیم جدید اور ملازمت و معاشی تحفظ کا سامان تو ملا مگر مذہبی تعلیم و تربیت سے محرومی کے باعث وہ مغربی تعلیم کے ان مضر اثرات سے خود کو نہ بچا سکے جو تہذیبی اور اخلاقی لحاظ سے ان برادران کے خاندان پر پڑے۔ مسلم معاشرہ پر اس کے جو دور رس اثرات پڑے ان پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مودودی نے بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں کہا تھا۔

"ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گذری ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، بندۂ شکم اور آسائشِ بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس سے پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے.... لیکن وہ بنیادی کمزوریاں جنھوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا ان میں پہلے سے موجود تھیں اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی اور افلاس کی حالت میں فطرتاً پیدا ہوتی ہیں ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں، ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و منزلت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی، دوسری طرف خود غرضی اور نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے ان کو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو ان

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی ص ۹۶۔۹۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو کچھ مال وجاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو۔[۱]

مسلمانوں کی اخلاقیات اور تہذیب پر مغربی تہذیب اور انگریزی نظامِ تعلیم کا دوسرا اثر بے حیائی اور بے پردگی کی شکل میں پڑا۔ پہلے تو انگریزوں نے لڑکیوں کے لیے علیٰحدہ تعلیم گاہیں قائم کیں مگر بعد میں مخلوط درس گاہوں اور مخلوط تعلیم کو رواج دیا۔ خاص طور پر ثانوی سطح پر مخلوط تعلیم جو لڑکے اور لڑکیوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ ہوتا ہے، اخلاقی لحاظ سے شدید نقصان کا باعث ہوا۔

بے پردگی اور بے حیائی مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں عام ہوئی اور عفت و عصمت اور شرم وحیا کی اسلامی قدریں پامال ہو کر رہ گئیں۔ انگریزی نظام تعلیم کے لیے یہ کشش کا ذریعہ تھی اس لیے تعلیم پہلے بے پردگی پھر برہنگی سے جڑ گئی۔ اس مخلوط تعلیمی ماحول میں لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ، جملے بازی اور جنسی بے راہ روی عام سی چیز بن گئی یہاں تک کہ وہ ادارے بھی اپنے بچے اور بچوں کو جنسی بے اعتدالی سے نہ بچا سکے جن کو خود مسلمانوں نے قائم کیا تھا۔ ماہر القادری نے ان لڑکیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا ؂

الجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
تو اور ہو مجروح تماشا مرے آگے

اب تو عالم یہ ہو گیا ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ سوسائٹی میں بے پردگی روشن خیالی اور پردہ نشینی رجعت پسندی تصور کی جاتی ہے، آزادیٔ نسواں، حقوقِ نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے دلفریب نعروں نے مسلم معاشرہ کو ایک عجیب کشمکش اور تناؤ میں مبتلا کر دیا ہے جس کا ۱۲ صدیوں تک کوئی چرچا نہ تھا۔ حالانکہ اسلام کے عطا کردہ حقوق، خواتین کو اس سے زیادہ وقار، اعتبار اور عظمت عطا کرتے ہیں جو مغربی تہذیب عطا کرنے کی دعوے دار ہے، چنانچہ مغربی تعلیم آزادیٔ نسواں کی جگہ آوارگیٔ نسواں کی محرک بن گئی۔

المیہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بعد

---

[۱] تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان ۱/۵۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں یہ احساس مسلمانوں میں عام ہوا تو لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں قائم ہوئیں جن میں دینی علوم اور عصری علوم کا امتزاج رکھا گیا اور دینی اور عصری علوم کی الگ الگ درس گاہیں بھی قائم ہیں۔

علماء کی تحریکِ مزاحمت

برطانوی حکومت کے ظلم و استحصال، مذہبی و تہذیبی جارحیت اور مغربی نظام تعلیم کے مذکورہ اثرات نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور ان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہبی وراثت کی حفاظت کے لیے خود کمربستہ نہیں ہوں گے تو ہندوستان میں ان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے گا، چنانچہ سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی ہر سطح پر انگریزوں کے اثرات ختم کرنے کا مسلمانوں میں جذبہ پیدا ہوا، پھر مزاحمت اور مقابلہ کی ان میں وہ تحریکیں پیدا ہوئیں جن کے سبب اسلامی تہذیب کا مستقبل روشن ہوا، بقول اقبال۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے موجوں ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

انگریزوں کے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے درمیان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار پر قائم جماعت موجود تھی، جن میں سید احمد شہید بریلویؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا فرحت حسینؒ، مولانا عبدالحیؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا ولایت علیؒ، مولانا عنایت علیؒ، مولانا احمد اللہؒ، مولانا عبداللہؒ، مولانا شاہ محمد حسینؒ، مولانا جعفر تھانیسریؒ، اور مولانا کرامت علی جون پوریؒ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں[1] یہ گروہ اور ان کے ہزاروں جاں نثار ۱۸۶۴ء تک انگریزوں کے خلاف مورچہ سنبھالے رہے اور جگہ جگہ کیمپ لگا کر انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد کچھ عرصہ تک جہاد کی تحریک کمزور رہی اور اسلام کے سپاہی مقدمات، سزاؤں اور تعزیروں کا سامنا کرتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسن دیوبندی کی انگریزوں کے خلاف ریشمی رومال

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، 'ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک' از مولانا مسعود عالم ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ نیز دیکھیے مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب تواریخ عجیب (کالا پانی) نیز مولانا غلام رسول مہر کی کتاب سرگزشتِ مجاہدین۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریک ناکام ہوئی۔ اور مولانا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مالٹا میں قید کیے گئے۔[1] پھر مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ملک بدر کرنے کی تحریک شروع کی جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی پر منتج ہوئی۔

دوسری طرف علماء کرام کی بڑی تعداد عیسائی پادریوں اور مبلغوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر بستہ ہوئی اور جگہ جگہ مناظرے کر کے اور کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ان کے اثرات ختم کرنے پر کاربند ہوئی۔ ہندوستان میں عیسائیت کے خلاف علماء اسلام کی تحریک مزاحمت ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

عیسائی مبلغین اور انگریز افسران یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہندوؤں کو بآسانی عیسائی بنا سکتے ہیں مگر مسلمان آسانی سے عیسائیت نہیں قبول کر سکتے کیونکہ وہ خود مضبوط عقیدہ اور روشن تعلیمات کے حامل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے رسالوں اور کتابوں کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمانوں کو مناظرے کی دعوت دی۔ ایسے ہی ایک مناظرہ کی بابت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے پادری کو لکھا کہ اگر آپ واقعی دل سے حق کے طالب ہیں تو آپ کو کسی محمدی عالم کا نام بتا دیا جائے گا اور اگر ہار جیت ہی مقصود ہے تو غریب مسلمانوں کو اس عنایت سے معاف رکھئے۔[2]

ابتداء میں علماء اسلام نے عیسائی پادریوں کی دعوتِ مناظرہ کو نظر انداز کیا مگر جب انھوں نے اسے مسلمانوں کی کمزوری سمجھا تو علماء نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ ان اعتراضات کے جواب دیے جو اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام پر وارد کیے جا رہے تھے اور ان کے دلائل کا توڑ کیا۔ اس طرح عیسائی مبلغوں کی پیش قدمی کو روکا، مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ کو خراب ہونے سے بچایا اور آگے بڑھ کر عیسائیوں کو قبولِ اسلام کی دعوت دی۔

عیسائیوں سے مناظرہ کی شروعات خود شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا سید محمد میاں، تحریک شیخ الہند، الجمعیۃ پریس۔ دہلی

۲؎ فتاویٰ امدادیہ ۴/ ۱۳۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی۔ جو پادری اسلام کے متعلق اعتراضات کرتا مولانا اس کے مسکت جواب دیتے[1]
اس عہد میں عیسائیوں سے مناظرہ کرنے والے اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے والے مصنفین اور علماء کی بڑی تعداد ہے ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خاںؒ، مولانا آل حسنؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ مولانا ابوالمنصور دہلویؒ، مولانا شرف الحقؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ کے نام نمایاں ہیں۔[2]

مسلمان محکوم اور شکست خوردہ تھے۔ اپنے معاشی مسائل میں الجھے ہوئے تھے اور عیسائی پادری خوش حال تنخواہ دار اور حکومت کی پشت پناہی میں تھے۔ پھر بھی ان علماء نے تقریر و تحریر دونوں محاذ پر ان کا بھرپور مقابلہ کیا اور ہندوستان کو نصرانی مملکت بنانے کا خواب پورا ہونے نہ دیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں میں حرکت و بیداری اور عزم و حوصلہ کی نئی لہر پیدا کر دی جب بھی کسی مناظرہ میں پادری کو شکست ہوئی تو مسلمانوں میں فتح کا سرور چھا جاتا۔ دینِ اسلام سے وابستگی مضبوط تر ہو جاتی۔ اور سیاسی محکومی کا غم کم ہو جاتا۔

عیسائیت کی تردید میں اردو زبان میں پہلی کتاب "خلاصۂ صولۃ الضیغم علی اعداء ابن مریم" مولوی عباس علی جاجموی نے لکھی اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ

> "قدیم عہد میں ردِ نصاریٰ کا عمل نہ تھا اور زور و شور اس دین کے منسوخ ہونے کا نہاں تھا۔ اگلے عالموں نے ان کے رد کی طرف کم توجہ دی۔ لیکن اس زمانہ کے عالموں پر فرض ہے۔ واجب ہے کہ اس دین کے ابطال پر کوشش کریں۔ ورنہ رفتہ رفتہ یہی لوگ خلق کثیر کو گمراہ کر ڈالیں گے۔ یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ رد لکھنے سے کفار قائل نہیں ہوتے پھر کیا فائدہ؟ کیونکہ جب میں صولۃ الضیغم لکھ چکا اور دس پانچ جگہ یہ امر مشہور ہو گیا تو لوگوں نے ویٹ اور ولیم پادریوں کی مجھ سے بحث کرادی، آخر میں خدا کی مدد سے ان پر غالب ہوا تب

---

[1] مولانا امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۲۵، دہلی ۱۹۴۹ء

[2] ایضاً ص ۲۲۲ عیسائیوں سے مناظرہ کرنے والے علماء کی فہرست مولانا امداد صابری نے تفصیل سے بیان کی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے رفیقوں میں سے جو نئے نئے عیسائی ہوئے ہیں دو شخص میرے پاس آکر مسلمان ہو گئے [1]

گارساں دتاسی نے ۱۸۶۸ء میں فرانس میں خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا: "مسلمان لوگ خاص کر اس آزادی (تبلیغ) سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں چنانچہ دہلی کے گلی کوچوں میں ان کے واعظ جلسے منعقد کرتے ہیں اور اپنے دین کی حمایت میں مسیحی مشنریوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں اور اپنے مذہب کی فضیلت ثابت کرتے ہیں" [2]

دتاسی نے مزید لکھا ہے کہ اگرچہ اس وقت مذہب اسلام کی پشت پناہی پر فاتح قوم کا تعصب کام نہیں کر رہا ہے لیکن اسلام بمقابلہ ہندو دھرم کے زیادہ اشاعت حاصل کر رہا ہے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے اخبارِ عالم میں میری نظر سے یہ خبر گذری کہ ایک شخص نے جس کا نام حاجی محمد ہے، پنجاب میں دو لاکھ ہندوؤں کو زمرہ اسلام میں شامل کر لیا ہے، ایک وہابی اور اس کے چند شاگرد دکن میں اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں، وہابیوں کی ایک بڑی جماعت پونا احمد نگر میں بھی ہے۔ حیدر آباد دکن میں ان کا ایک بڑا گروہ موجود ہے [3]

علماء اسلام کی ان دعوتی کوششوں کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ مسلمانوں پر مشنریز کی کوششیں غیر موثر ہو کر رہ گئیں اور معدودے چند مسلمان ہی جہالت اور ناداری کا شکار ہو کر مرتد ہو سکے۔ بقول دتاسی "ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کیا" [4]

دوسرا نتیجہ یہ نکلا غیر مسلم حضرات کو جن میں ہندوؤں کے علاوہ مسیحی بھی شامل ہیں اسلام کی دعوت کو سننے سمجھنے اور اپنے مذاہب سے موازنہ کرنے کا موقع ملا جس کے سبب وہ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ عیسائیوں کے قبولِ اسلام پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے گارساں دتاسی نے ۱۸۶۹ء میں کہا تھا:۔

"یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ زمرۂ اسلام میں

---

[1] فرنگیوں کا جال ص ۱۲۹

[2] خطبات گارساں دتاسی ص ۶۶۳

[3] ایضاً ص ۵۰۷

[4] ایضاً ص ۶۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شامل ہو رہے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض عیسائی لوگ نہ معلوم کیوں اسلام قبول کر لیتے ہیں..... اردو کے ایک اخبار "چشمۂ علم" میں ان غریب یورپینوں کے قبولِ اسلام کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ محتاج لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوئے اور قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ بعض دوسرے یورپینوں کا ارادہ تھا کہ اسلام قبول کر لیں اور مکہ حج کے لیے جائیں..... ایک سوئزرلینڈ کے باشندے نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اب وہ مشرقی لباس زیب تن کیے ہندوستان میں تبلیغ کرتا پھرتا ہے [۱]

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۸۱

اسلامی نظام معاشرت پر اعتراضات کا مسکت جواب

مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ

مولانا سید جلال الدین عمری

اس کتاب میں اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ پر مخالفین کے اعتراضات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے اور بہت مدلل انداز میں ان کا رد کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسلام کے زیر سایہ عورت کو حاصل حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں مہر نفقہ، تعدد ازدواج، طلاق، نفقہ مطلقہ، خلع، حجاب، وراثت، قصاص، دیت، شہادت، خاندان کی سربراہی اور سیاسی قیادت جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ مصنف نے بدلائل واضح کیا ہے کہ ان تمام مسائل میں اسلام نے عورت کی مخصوص جسمانی صلاحیت اور طبعی رجحانات و میلانات کی بھرپور رعایت کی ہے اور اس کے حقوق اور ذمہ داریوں میں توازن رکھا ہے۔ تیسرا ایڈیشن۔ صفحات ۲۰۰۔ قیمت ۶۰ روپے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی نے The Rights of MUSLIM WOMAN - An Appraisal کے نام سے شائع کیا ہے۔ صفحات: ۲۴۴ قیمت ۷۰ روپے

اس کا ہندی ترجمہ بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

ملنے کے پتے
(۱) ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ۔ ۱
(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ ابو الفضل انکلیو۔ نئی دہلی۔ ۲۵

© rasailojaraid.com